

## علامہ اقبال اور عصر جدید کی جمہوریت

محمد مظہر الدین صدیقی

علامہ اقبال کے بعض اشعار سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ وہ عصر جدید کی جمہوریت کے مخالف تھے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو  
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید  
اسی طرح ان کا ایک اور شعر ہے۔

جمہوریت وہ طرز حکومت ہے کہ جس میں  
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

لیکن جب ہم اقبال کی نثری تصانیف کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جمہوریت کے مخالف ہرگز نہیں تھے البتہ یہ ممکن ہے انہیں جدید جمہوریت کے بعض نقائص کا شدید احساس ہو۔ بات یہ ہے کہ اقبال کی زندگی میں روس کا کمیونسٹ انقلاب برپا ہوا جو ایک لحاظ سے جمہوریت کے خلاف ایک باغیانہ رد عمل تھا۔ پھر مسولینی نے اطالیہ میں فاسطی نظام قائم کیا اور علانیہ جمہوریت کی مخالفت کی۔ ان واقعات کا اثر اقبال پر بھی ہوا۔ اور سزید یہ کہ انہوں نے متحدہ ہندوستان میں اپنے گرد و پیش جمہوریت کی جو شکل دیکھی وہ بھی انہیں پسند نہ آئی۔ ان تمام عوامل کا اثر ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔ لیکن اقبال بالطبع جمہوریت پسند تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ فرد کی اہمیت اور قدر و قیمت پر بڑا زور دیتے تھے اور ان کا فلسفہ خودی یک قلم ایسی اجتماعیت کی نفی ہے جس میں انفرادی آزادی اور فرد کی شخصیت کو بالکل کچل دیا گیا ہو۔ اقبال کی نثری تصانیف میں سب سے

زیادہ اہم ان کے انگریزی خطبات کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کے چھٹے خطبہ میں اسلام کے عقیدہ توحید کا ذکر کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں ”بحیثیت ایک سیاسی نظام کے اسلام اصول توحید کو انسان کی عقلی اور جذباتی زندگی میں عملاً منسکل کرتا ہے۔ اسلام خداوند تعالیٰ کی ذات سے وفاداری کا مطالبہ کرتا ہے نہ کہ تخت و تاج سے وفاداری کا اور چونکہ ذات خوداوندی ساری زندگی کی روحانی اساس ہے اس لئے خداوند تعالیٰ کی ذات سے وفاداری کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی مثالی فطرت کا وفادار ہو،“ ۱

اسی خطبہ میں اجماع کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں ”اسلامی قانون کا تیسرا ساخذ اجماع ہے جو میرے خیال میں اسلام کا اہم ترین قانونی تصور ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس تصور کے متعلق اسلام کے ابتدائی دور میں بھی اگرچہ گرم علمی بحثیں جاری رہیں لیکن اسے ایک مستقل ادارہ کی شکل دینے کی کوئی کوشش کسی اسلامی سلک میں عمل میں نہیں آئی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ خلیفہ چہارم حضرت علی رض کے بعد جس قسم کی مطلق العنان شاہی حکومتیں قائم ہوئیں ان کا مفاد اس میں نہ تھا کہ اس تصور یعنی تصور اجماع کو ایک مستقل قانونی ادارہ میں متشکل کیا جاتا۔ اموی اور عباسی حکومتوں کے مفاد کا تقاضا یہ تھا کہ اجتہاد کا اختیار فرداً فرداً ہر مجتہد کو حاصل رہے نہ یہ کہ یہ اختیار کسی مجلس قانون ساز کو سونپا جائے جو ان حکومتوں کے بالمقابل صف آرا ہونے کی طاقت رکھتی ہو۔ پھر حال یہ امر اطمینان بخش ہے کہ دنیا جدید کے تقاضے اور یورپی اقوام کے سیاسی تجربات عہد جدید کے مسلمانوں کو تصور اجماع کی قدر و قیمت اور اسکانات سے روشناس کر رہے ہیں۔ جمہوری خیالات کی ترقی اور اسلامی ممالک میں قانون ساز مجالس کی تدریجی تشکیل ترقی کا ایک بڑا قدم ہے۔ ۲۔ ترکی کے جمہوری انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے اقبال واضح

الفاظ میں جمہوریت کی تائید کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں، ”ترکوں کا اجتہاد یہ ہے کہ اسلام کی روح کے مطابق خلافت یا اسات متعدد اشخاص پر مشتمل ایک جماعت یا ایک منتخب کردہ مجلس قانون ساز کو تفویض کی جا سکتی ہے۔ مصر اور ہندوستان کے علماء نے اس موضوع پر ابھی تک اظہار خیال نہیں کیا ہے لیکن شخصی طور پر سیرا یہ یقین ہے کہ ترکوں کا یہ نظریہ بالکل درست ہے۔ جمہوری طرز حکومت نہ صرف اسلام کی روح سے مطابقت رکھتا ہے بلکہ عالم اسلام میں جو نئی قوتیں کار فرما ہیں ان کے پیش نظر یہ طرز حکومت ضروری ہو گیا ہے۔“

فرد کی آزادی اور حریت اور اس کی شخصیت کی قدر و قیمت کا تحفظ جمہوریت کا بنیادی اصول ہے۔ لیکن زندگی کی اجتماعی تنظیم میں بعض نظامات اس قدر غلو سے کام لیتے ہیں کہ وہ فرد کے لئے آزادی کا کوئی دائرہ نہیں چھوڑتے۔ نظم و ضبط جب ایک حد سے آگے بڑھ جائے تو وہ فرد کی شخصیت کو مضمحل کر دیتا ہے اور لامحدود پابندیاں شخصیت کے ارتقاء میں مزاحم ہو جاتی ہیں۔ اقبال نے اس صورت حال کے خلاف موثر احتجاج کیا ہے۔ بغداد کی تباہی کے بعد جو حالات پیدا ہوئے ان کا ذکر کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں کہ چونکہ عالم اسلام اس وقت ایک دور انتشار سے گزر رہا تھا اس لئے فقہائے اسلام کی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں یکسانیت اور ہم آہنگی قائم رہے چنانچہ انہوں نے یہ کوشش کی کہ مسلمانوں میں کسی قسم کی جدت پسندی نہ پیدا ہونے دی جائے بلکہ ائمہ اربعہ نے شریعت اسلام کی تو تعبیر کی تھی اس کو من و عن قبول کر لیا جائے اور اس میں کوئی ترمیم یا اضافہ نہ ہونے پائے۔ ”ان کا یعنی فقہائے اسلام کا خیال یہ تھا کہ معاشرتی نظم میں کوئی خلل واقع نہ ہو اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک حد تک ان کا یہ خیال صحیح تھا کیونکہ تنظیم کے ذریعہ کسی حد تک ان

قوتوں کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے جو قوموں کو زوال کی طرف لے جاتی ہیں۔ لیکن انہوں نے اس امر کو نظر انداز کر دیا اور ہمارے موجودہ علماء بھی اس امر کو نظر انداز کر رہے ہیں کہ کسی قوم کی تقدیر کا انحصار تنظیم پر اتنا نہیں ہوتا جتنا انفرادی شخصیتوں کی نشوونما اور قوت پر ہوتا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں ضرورت سے زیادہ تنظیم سے کام لیا گیا ہو فرد کی شخصیت کو بالکل پامال کر دیتا ہے وہ یعنی فرد معاشرتی فکر کی ثروت سے تو مالا مال ہو جاتا ہے لیکن اپنی روح کی دولت کو کھو بیٹھتا ہے اس لئے زوال کی قوتوں سے نبرد آزما ہونے کی صورت صرف یہ ہے کہ ایسے افراد پیدا ہوں جو (self Concentrated) ہوں، یعنی اپنی خودی میں گم ہوں ایسے ہی افراد زندگی کی گہرائیوں تک پہنچ کر انہیں بے نقاب کر سکتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ نئے معیارات پیش کر سکتے ہیں جن کی روشنی میں ہمیں یہ نظر آنے لگتا ہے کہ ہمارا ماحول پوری طرح صحت مند نہیں ہے اور اس میں تبدیلی ضروری ہو گئی ہے، اس اقتباس سے یہ ظاہر ہے کہ اقبال کمیونزم یا کسی اور ایسے نظام کے مخالف ہیں جس میں زندگی کو اتنا زیادہ منظم بنانے کی کوشش کی جائے کہ فرد کی آزادی اور حریت کا وجود سٹ جائے اس سے یہ نایت ہوتا ہے کہ اقبال بالطبع جمہوریت پسند ہیں۔

اسلامی تصور جمہوریت کی وضاحت کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں کہ اسلام کی رو سے پوری امت مسلمہ نہ کہ کوئی خاص فرد سیاسی اختیارات کی حامل ہے البتہ انتخاب کنندگان کسی باصلاحیت فرد کو یہ امانت سپرد کر دیتے ہیں اس طرح یہ حکمران فرد پوری قوم کا نمائندہ ہو جاتا ہے۔ لیکن سیاسی اختیارات استعمال کرنے کے باوجود یہ نمائندہ عام مسلمانوں کے مقابلہ میں کوئی امتیاز و تفوق نہیں رکھتا۔ شریعت کی نگاہ میں اس کی حیثیت وہی رہتی ہے جو ایک عام مسلمان کی ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اسلام میں نصوص

صریحہ کے بعد ملت اسلامیہ کی اجتماعی رائے یعنی اجماع قانون سازی کی بنیاد ہے حدیث میں آتا ہے۔ کہ مسلمانوں کی اکثریت جس بات کو پسند کرتی ہے اللہ تعالیٰ بھی اس بات کو پسند کرتا ہے۔ ( )

اس حدیث سے استنباط کر کے امام شافعی نے یہ اصول وضع کیا کہ مسلمان کبھی ضلالت و گمراہی پر متفق نہیں ہو سکتے۔

اقبال کے نزدیک ”مسلمانوں کا خلیفہ ان کا سب سے اعلیٰ مذہبی رہنما نہیں ہوتا ہے اور نہ وہ زمین پر خدا کا نائب ہوتا ہے۔ نہ ہی وہ معصوم ہے۔ دیگر مسلمانوں کی طرح وہ بھی شریعت کے تابع ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ اسلام شخصی حکمرانی کا مخالف ہے۔ ہر مسلمان کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ خلیفہ پر آزادانہ تنفیذ کرے۔ ایک بوڑھی عورت نے حضرت عمرؓ پر اعتراض کیا کیونکہ اس کے خیال میں حضرت عمرؓ قرآن کا مفہوم صحیح طور سے سمجھنے سے قاصر رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے بوڑھی عورت کی اعتراضات نہ صرف خندہ پیشانی سے منے بلکہ فیصلہ بھی اس کی رائے کے مطابق کیا۔ جہاں تک انتخاب کنندگان کی قابلیت کا تعلق ہے اقبال کہتے ہیں کہ مال و جائیداد کی کوئی شرط عائد نہیں ہوتی۔ تمام مسلمان مرد اور عورتیں انتخاب میں حصہ لے سکتی ہیں اگرچہ غلاموں اور عورتوں کو انتخاب میں حصہ لینے کا موقع نہیں ملا۔ آخر میں اقبال کہتے ہیں کہ کوئی طرز عمل جو فرد کی آزاد شخصیت کے ارتقاء میں مزاحم ہو اسلامی اخلاقیات اور شریعت کی رو سے جائز نہیں ہو سکتی۔“

مسلمانوں کے سیاسی جمود پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے انتخابی طریق کار کو کبھی نہیں اپنایا۔ بغداد اور اندلس میں ایک قسم کا انتخابی عمل ہوتا رہا لیکن کوئی ایسے سیاسی ادارے قائم نہیں کئے گئے جو سیاسی زندگی میں استحکام اور تسلسل پیدا کر سکتے۔ اقبال

نے مسلمانوں میں سیاسی سرگرمیوں کے فقدان کے دو اسباب بتائے ہیں۔ اولاً ایرانی اور سنگول دو بڑی قوموں نے اسلام تو قبول کر لیا مگر ان کے لئے انتخابی طریق کار نہ صرف بالکل ناقابل قبول تھا بلکہ وہ اس طریق کار کے سخت مخالف تھے۔ ڈوزی کہتا ہے کہ ایرانی ہمیشہ اپنے بادشاہوں کی پرستش کیا کرتے تھے اور انہیں الوہیت کا مظہر سمجھتے تھے۔ وہ ہر ایسے بادشاہ کے خلاف آسادہ بغاوت ہو جاتے تھے جو مظہر الوہیت ہونے کا مدعی نہ ہوتا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ مسلمان عموماً فوجی فتوحات میں منہمک رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام طاقت اور اختیار ایک فرد واحد کے ہاتھ میں آ گیا جمہوریت اور فوجی توسر ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتی۔ مغرب نے جو اثرات مسلمانوں پر چھوڑے ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ ہمیں مغرب کا سنون ہونا چاہئے کہ اس نے ہمارے اندر سیاسی زندگی پیدا کی۔ ۶

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم جو اقبال کے بہت بڑے شارح ہیں، اپنی تصنیف 'فکر اقبال، میں لکھتے ہیں۔

''علامہ اقبال مغربی جمہوریت کے اس طریق کار کے مخالف تھے جس کی وجہ سے قوم کے صالح ور عاقل فراد مجالس آئین ساز میں داخل نہیں ہو سکتے۔ بعض مشرقی ممالک نے جو مغربی طریق انتخاب رائے اعضائے مجلس کا ڈھانچہ تقلیداً اختیار کر لیا ہے یا ان کے گزشتہ فرنگی حکمران مصلحتاً اس کو رائج کر گئے ہیں اس میں سے عجیب و غریب نتیجہ نکلتا ہے کہ علم و فضل والے اہل الرائے منتخب نہیں ہو سکتے۔ ووٹ ایسے جاہل زمینداروں کو ملتے ہیں جو اپنا نام تک نہیں لکھ سکتے۔ کسی شخص کو نو اس کے علم کی بنا پر نہ موجودہ سیاست و معیشت کے فہم کی بنا پر اور نہ اس کے اخلاق حسنہ کی بنا پر منتخب کر کے واضح قوانین بنایا جاسکتا ہے۔ بلکہ کہیں ووٹ برادری کی بدولت ملتے ہیں، کہیں زمینداری اور سرمایہ داری کی بدولت اور کہیں

کہیں عوام کی ابلہ فریبی اور بے خلوص خطابت سے بھی مطلب حاصل ہوتا ہے۔ غرضیکہ نہ علم نہ سیرت نہ معاملہ فہمی یا زرو زمین سے حکمرانی میں حصہ ملتا ہے یا نہایت ذلیل دروغ بافی اور جذبات انگیزی سے، اسی جمہوریت کے متعلق علامہ فرماتے ہیں کہ اس میں انسان کو گنا جاتا ہے اور تولا نہیں جاتا اور اس قسم کے دو سو گدھے بھی اگر ایک ایوان میں ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے کے لئے جمع ہوجائیں تو وہاں انسانیت کی کوئی آواز سنائی نہیں دے سکتی۔

فکر صالح رکھنے والا ہر شخص یہ سوچتا ہے کہ اگر مغرب کا یہ طرز جمہوری ناقص ہے تو اس کا بدل کس طرح پیدا کیا جائے۔ مغرب تو آخر کار اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کا جو بھی بدل ہوگا وہ اس سے ناقص تر اور اس سے زیادہ خطرات سے لبریز ہوگا۔ لہذا اس کی مسلسل اصلاح کی جائے تاکہ یہ عیوب سے پاک ہوگا جائے اور تمام شہریوں کے بنیادی حقوق کی حفاظت سے زیادہ اور بہتر سے بہتر ہو سکے۔ اس جمہوریت سے مایوس اور کابل بیزاری نے مغرب میں یا سولینی اور ہٹلر پیدا کئے یا روس اشتراکیت اقبال نے ان سب کو ناقص سمجھا اور اپنے ذہن میں اسلامی جمہوریت کا ایک تصور جماتے رہے جس کی عملاً معین صورت اس وقت کسی کی سمجھ میں نہیں آئی۔ کوئی قابل عمل اسلامی نظام کا خاکہ پیش کرنے کے بجائے اب وہ کہتے ہیں کہ اس طرز جمہوری سے بھاگ کر کسی پختہ کار کی غلامی قبول کرلو، اس پختہ کار سے ان کی مراد کوئی عاقل و مجاہد درویش منس مرد سوسن ہے۔ ایسا مرد کابل ملت اسلامیہ میں تو کہیں نظر نہیں آتا تو پھر کیا کیا جائے سوائے اس کے کہ انتظار کریں کہ

مرد از غیب بروں آید و کارے بکند،،،

لیکن سوال یہ ہے کہ ایسے درویش منس مجاہد کی آمد کا کب تک انتظار

کیا جائے اور کیا اس دوران کاروبار حکومت بالکل معطل رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت قابل عمل نہیں ہے۔ اسلئے یہ ماننا پڑے گا کہ اب تک جمہوریت کا کوئی بہتر بدل تلاش نہیں کیا جاسکا اور اہل مغرب کا یہ خیال صحیح ہے کہ اگر اس میں نقائص ہیں تو ان کی اصلاح کی جائے جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں اقبال بالطبع جمہوریت پسند ہیں وہ فرد کی آزادی اور خودی کے ارتقاء کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ اس لئے کیسے کہا جاسکتا ہے کہ وہ جمہوریت کے مخالف تھے، اصل میں وہ جمہوریت کی ناقص شکلوں سے بیزار تھے اور مثالی جمہوریت قائم کرنا چاہتے تھے مگر جیسا کہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے لکھا ہے کہ اس مثالی جمہوریت کا کوئی قابل عمل خاکہ پیش نہ کر سکے۔ اب یہ پاکستانی قوم کا اخلاقی، ملی اور سیاسی فرض ہے کہ وہ اقبال کے بلند افکار اور انقلابی تعلیمات اور اپنے تیس سالہ سیاسی و اجتماعی تجربات کی روشنی میں سنجیدگی سے اپنے اجتماعی نظام کا جائزہ لے، اور جمہوری اداروں کو صحت مند اخلاقی اور روحانی قدروں پر قائم کرنے کے لئے قابل عمل خاکہ مرتب کرے۔

#### حوالہ جات

- ۱ - تشکیل جدید الہیات اسلامی (انگریزی) لاہور ۱۹۶۲ء ص ۱۴۷
- ۲ - تشکیل جدید الہیات اسلامی (انگریزی) لاہور ص ۱۷۳، ۱۷۴
- ۳ - تشکیل جدید الہیات اسلامی (انگریزی) ایضاً ص ۱۵۷
- ۴ - تشکیل جدید الہیات اسلامی (انگریزی) ایضاً ص ۱۵۱
- ۵ - سید عبدالواحد بیمنی - مقالات اقبال لاہور ۱۹۶۳ء ص ۸۸، ۸۹، ۹۹
- ۶ - سید عبد الواحد بیمنی - مقالات اقبال ۱۰۰، ۱۱۱، ۱۱۲
- ۷ - ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم - فکر اقبال تیسرا ایڈیشن ۱۹۶۳ء ص ۲۶۶، ۲۶۷